حرکت ہوگی۔''

''کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں ہوگی۔''

میں نے ناصر کی طرف دیکھا۔ ناصر چپ۔

میرے تامل کو دیکھ کر آخر طے یہ ہوا کہ ناصر طفیل صاحب سے بات کرے گا۔ ہم دونوں طفیل صاحب سے جا کر ملے۔ ناصر نے بات کی۔ طفیل صاحب نے افسانہ واپس دینے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر وہ افسانہ ''نقوش'' ہی میں چھپا۔ لیکن طفیل صاحب سے میری جو ایک وضعداری چلی آتی تھی اس میں ہمیشہ کے لیے ایک دراڑ پڑ گئی۔

اب شیخ صاحب اور حنیف نے مجھے نوٹس دیا کہ دوسرا افسانہ فوراً لکھو۔ اور وہ افسانہ اس افسانے سے کمتر نہیں ہونا چاہیے۔ اگلے ہفتے ہم وہ افسانہ سنیں گے۔

تو دوستوں کے جبر نے ہفتے کے اندر اندر مجھ سے دوسرا افسانہ لکھوایا۔ اتنے مختصر عرصے میں شاید پہلی مرتبہ میں نے کوئی افسانہ لکھا تھا۔ مقررہ شب دوستوں کے بیچ بیٹھ کر سنایا۔ تینوں نے اطمینان کا سانس لیا' خوشی کا اظہار کیا ''یہ افسانہ اس سے بھی بہتر ہے۔''

یہ وہ افسانہ تھا جو سویرا میں ''سیڑھیاں'' کے عنوان سے چھپا اور اب میرے کسی مجموعہ میں شامل ہے۔ چونکہ اس وقت میرے سب ہی دوستوں نے اس افسانے کو پاس کر دیا تھا۔ بعد میں میرے سمجھدار نقادوں نے بھی اس لائق توجہ جانا۔ سو کیا مضائقہ ہے کہ میں اسے اپنی اچھی تحریروں میں شمار کر لوں۔ سو اگر ایسا ہے تو پھر میں یہ کیوں مانوں کی جبر سے اچھا شعر' اچھا افسانہ نہیں لکھوایا جا سکتا۔ ہاں یہ دیکھنا پڑے گا کہ جبر کی نوعیت کیا ہے۔ اور جبر کرنے والا کون ہے۔ ڈکٹیٹر' پارٹی لائن' یا وہ دوست جو تمہارے تخلیقی جذبے کو اکسا رہے ہیں یا تخلیقی غیرت کو للکار رہے ہیں۔

ہاں مجھے اپنا ناولٹ ''دن'' بھی شاید اسی کھاتے میں ڈالنا چاہیے۔ چونکہ اس وقت حنیف نے ''سویرا'' کے لیے چند منتخب لکھنے والوں کو ناولٹ لکھنے کی دعوت دے رکھی تھی۔ لگے ہاتھوں مجھے بھی نوٹس دیدیا کہ اس نمبر کے لیے تمہیں ناولٹ لکھنا ہے اور ہر صورت لکھنا ہے۔ تو کیا میں اس ناولٹ کو بھی حنیف رامے کے جبر کا ثمر کہوں

''مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی''

پھر کچھ مزاج کی بھی بات ہوتی ہے۔ حنیف نے ''سویرا'' کے لیے ناصر پر بھی ایسی ہی پابندی لگائی تھی۔ اس سے میر پر مضمون لکھوانا تھا۔ مت پوچھو کہ ناصر کو کس کس طرح گھیرا گیا۔ کیا کیا پابندیاں عائد کی گئیں۔ حسن طارق نے اپنی فلم کے لیے اس سے گیت

لکھنے کی فرمائش کی۔ ناصر فوراً آمادہ ہوگیا۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ ٹی ہاؤس میں روز شام کو حسن طارق کا فون آتا۔ ہمارا کام اسے یہ بتانا تھا کہ آج ناصر ٹی ہاؤس نہیں آیا۔ جب وہ ٹی ہاؤس آتا تو ناصر سٹک کر باتھ روم میں چھپ جاتا اور ہم حسن طارق کو بتاتے کہ ناصر آیا تو تھا' کسی کے ساتھ چلا گیا۔

ناصر کو ایک برس حلقہ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرنی پڑ گئی۔ مگر خطبہ کیسے لکھا جائے۔ ناصر سے کچھ بھی کہنے کو کہہ دو بس سر پہ مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا تھا۔ اجلاس کے بیچ دو دن رہ گئے۔ منتظمین پریشان کہ خطبہ کب لکھا جائے گا' کب چھپے گا۔ ناصر کی ڈھونڈیا پڑی ہوئی تھی۔ ناصر غائب تھا۔ بڑی مشکل سے برآمد ہوا۔ اب اس کے لیے مفر نہیں تھا۔ گھبرایا ہوا میرے دفتر آیا۔ بولا ''بڑی مشکل ہے۔ حلقہ کا خطبہ لکھنا ہے۔''

''پھر لکھو۔''

''کیسے لکھوں۔ ویسے جو کہنا چاہتا ہوں وہ تو سارا ذہن میں ہے۔'' اور اس نے بتانا شروع کیا کہ اس خطبہ میں وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ ''مگر اس کا مضمون کیسے بناؤں۔''

میں نے وہی نسخہ استعمال کیا جو مولیر کے اس کردار کے استاد نے استعمال کیا تھا جو فنون لطیفہ اور شاعری کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد استاد سے ملتجی ہوا کہ اب مجھے بتایئے کہ نثر کیا ہوتی ہے۔ اور نثر لکھنے کا فن سکھایئے۔ استاد نے کہا کہ جو تم بول رہے ہو یہی نثر ہے۔ وہ سخت حیران ہوا کہ اچھا تو میں ساری عمر نثر بولتا رہا ہوں۔ میں نے ناصر سے کہا کہ جو تم بول رہے ہو یہ بنا بنایا مضمون ہے۔ بس اسے اسی طرح لکھ دو۔

''مگر لکھوں کیسے؟''

''بس قلم اٹھاؤ اور لکھنا شروع کر دو۔''

''مشکل یہ ہے کہ جب میں نثر لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہوں تو قلم اور کاغذ کے بیچ میں صحرائے اعظم آجاتا ہے۔''

''اچھا تم بولو۔ میں لکھتا ہوں۔''

ناصر تھوڑی دیر بولتا رہا' میں لکھتا رہا۔ ''اچھا لاؤ' اب میں خود لکھا ہوں۔'' اب ناصر کو یقین آ گیا تھا کہ وہ جس طرح بول رہا ہے اسے اسی طرح لکھ دیا جائے تو خطبہ تیار ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر تک لکھنے کے بعد بولا ''یاں سے اٹھو۔ چائے خانے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ پھر لکھتے ہیں۔''

لیجئے قریب کے ایک چائے خانے میں چل کر بیٹھ گئے۔ ناصر نے وہاں بیٹھ کر اچھا خاصا لکھ لیا۔ ''اچھا اب ٹی ہاؤس چلتے ہیں۔''

ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر چائے پی۔ کچھ سطروں کا اضافہ وہاں ہوا۔ ''اچھا اب میں چل پڑا ہوں۔ گھر جا کر مکمل کروں گا۔''

بلی اپنے بچے کو سات گھر جھنکاتی ہے پھر اس کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ ناصر نثر لکھنے کے معاملہ میں بالکل بلی تھا۔

لکھنا رو رو کر۔ بولنا فراٹے کے ساتھ۔ لیجئے کیا بات یاد آئی۔ وہ تو میں بھولا ہی جا رہا تھا۔ انہیں دنوں جب ہم ''سویرا'' کے دفتر میں بیٹھتے تھے اور آدھی آدھی رات تک بولتے تھے میں نے اور ناصر نے ایک واردات کر ڈالی۔ واردات ناصر ہی نے کی۔ میں تو بس لقمہ دے رہا تھا۔ اسے آپ ٹیبل ٹاک کا شگوفہ کہہ لیں۔ یہ شگوفہ کیسے پھوٹا۔ ہم شام کو ٹی ہاؤس میں اکٹھے ہوئے۔ طریقہ یہی تھا کہ ٹی ہاؤس میں اکٹھے ہوتے۔ یہاں باری لگا کر پھر ''سویرا'' کے دفتر کی طرف جاتے۔ تو شیخ صاحب کا انتظار تھا۔ وہ آئے نہیں۔ مشتاق کو موقعہ ملا ''ناصر علموں بس کریں او یار شیخ صاحب کا علم تمہاری غزل کو لے بیٹھے گا۔''

مشتاق نے بات کیا کی تھی' ایک تیر مارا تھا کہ ناصر کے دل میں جا کر ترازو ہو گیا۔

''اٹھو یاریاں سے'' ناصر نے جھرجھری لی ''آج شیخ صاحب نہیں آئیں گے۔ سویرا کے دفتر کا پروگرام موقوف۔ میٹرو چلتے ہیں۔''

کتنے دنوں بعد ہم میٹرو آئے تھے۔ اتنا آباد نہ سہی مگر نقشہ وہی تھا۔ وہی اینجلا وہی صندلی بلی۔ وہی سلیم شاہد کا ٹہلتے ٹہلتے آنا اور ناصر سے شعر کی فرمائش کرنا۔ سلیم شاہد کا گھر لکشمی منشن میں تھا۔ منٹو صاحب کے گھر کے برابر۔ مگر خانہ برباد نے جانے کن حالات میں کب گھر چھوڑا تھا۔ اب تو یہی لگتا تھا کہ صدا سے میٹرو میں رہتے ہیں۔ رات بھیگنے پر کسی بھی گھڑی نمودار ہو جاتے۔ خوب صورت نقش' گوری رنگت' شربتی آنکھیں' کچھ خمار کی کیفیت لیے ہوئے' دہرا بدن۔ اپنے حال میں مست' ٹہلتے ٹہلتے آتے اور ہماری میز کے سرے پر آ کھڑے ہو جاتے۔ ناصر سے مخاطب ہوتے ''ناصر' کوئی شعر سناؤ۔ نیا ہو۔''

ناصر شعر سناتا۔ کھڑے کھڑے لطف لیتے' داد دیتے اور واپس چلے جاتے۔

آج کیبرے کا دن نہیں تھا۔ فلور بھی کچھ بھرا نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف دو جوڑے' کچھ تھکے تھکے انداز میں مصروف رقص تھے۔ بینڈ بھی اسی حساب سے تھکا تھکا بج رہا تھا۔

''بہت فلسفہ بگھار لیا۔'' ناصر بولا ''آج غیر علمی باتیں ہوں گی۔''

''شکر ہے کہ آج شیخ صاحب نہیں ہیں۔''

مشتاق نے ٹکڑا لگایا۔

''یار ٹیبل ٹاک ہونی چاہیے۔''

''بہت اچھا خیال ہے۔'' مشتاق نے تائید کی۔

''انتظار، ہم غالب پہ بات کریں گے مگر بالکل غیر علمی انداز میں۔'' رک کر ''مگر ریکارڈ کیسے ہوگی۔''

مشتاق نے فوراً جیب سے قلم نکالا۔ کاپی کھولی۔ کاغذ نکالا ''تم لوگ باتیں کرو۔ میں لکھتا ہوں۔''

ٹیبل ٹاک کا عنوان قائم کیا گیا ''غالب اور ہم۔'' ''ماہ نو'' میں اشاعت کے لیے رفیق خاور کو پوسٹ کر دیا۔ اس بندہ خدا نے بلا تامل اسے ''ماہ نو'' کی تازہ اشاعت میں شامل کر لیا۔ ''ماہ نو'' سرکاری پرچہ ہونے کے باوجود اس زمانے میں معقول قسم کا ادبی رسالہ تھا۔ دائرہ اشاعت اس کا وسیع تھا۔ شور مچ گیا کہ ''ماہ نو'' میں یہ کیا چھپا ہے۔ اور داد سے زیادہ بیداد۔ بعضوں نے ہنسی میں اڑایا۔ بعضوں کو غصہ آیا۔ ہم مطمئن کہ ردعمل ہماری توقع کے مطابق ہوا۔ اسی رو میں ہم نے دو ڈھائی ٹیبل ٹاک اور کر ڈالیں۔ وہ بھی ''ماہ نو'' میں چھپیں۔

شیخ صاحب اور حنیف کے کچھ ذہنی تحفظات تھے۔ اصل اعتراض یہ تھا کہ گفتگو برحق مگر ان میں علم کی کمی ہے۔ اس کمی کو دور کرنے کی نیت سے ''سویرا'' کے دفتر میں گفتگو کا اہتمام کیا گیا۔ وہاں یہ ہوا کہ علم زیادہ ہو گیا۔ بہر حال گفتگو کے دو دور چلے۔ ایک کا عنوان ''خوشبو کی ہجرت۔ دوسری کا عنوان ''رفتار بدن۔'' ''ٹیبل ٹاک'' کی بجائے اسے مکالمہ کا نام دیا گیا کہ اس نام میں انہیں ایک علمی ثقاہت نظر آتی تھی۔ یہ مکالمات ''سویرا'' میں شائع ہوئے۔

◆◆◆

ستاون اٹھاون

اب 1957ء شروع ہو رہا تھا۔ ٹی ہاؤس کا نقشہ جوں کا توں تھا۔ مگر ہماری میز کی فضا بدل چکی تھی۔ وہ جو سلسلہ تھا کہ ٹی ہاؤس کے بند ہوتے ہوتے وہاں سے اٹھے اور سویرا' کے دفتر میں جا کر پڑاؤ کیا۔ وہ سلسلہ اب ختم ہو گیا۔ حنیف رامے کی شادی ہو گئی تھی۔ اب وہ آوارہ گردی سے توبہ کر کے شریفانہ زندگی گزارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تو سمجھ لو ہمارے بیچ میں سے ایک تنگ نکل گیا اور ہاں اب مظفر بھی ہمارے بیچ نہیں تھا۔ وہ ملازمت کی تقریب سے لاہور سے جا چکا تھا' مگر اب سعید محمود قیوم صاحب کی میز سے قطع تعلق کر کے ہمارے بیچ رس بس چکا تھا۔

انہی دنوں ناصر کی زندگی میں دو تبدیلیاں آئیں اور ان دونوں تبدیلیوں کے براہ راست ہم پر اثرات مرتب ہوئے۔ ایک تبدیلی ناصر کے یہاں یوں آئی کہ ''ہمایوں'' بند ہو گیا۔ کتنے زمانے سے یہ ماہنامہ کتنی پابندی سے نکل رہا تھا کہ نمازی کی نماز قضا ہو جائے مگر ہمایوں کا مہینے کی پہلی کو شائع ہو جانا اٹل تھا۔ ایک تو ایسی پابندی کے واسطے سے اس نے ادبی رسالوں کی دنیا میں اپنا امتیاز قائم کیا تھا۔ باقی امتیازات الگ ہیں۔ کس شان کے ساتھ مہینے کے مہینے اپنی پریشانی پر اس شعر کو جھومر بنائے قارئین کے ہاتھوں میں پہنچتا تھا۔

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

مگر ہمایوں زمانے کی چال سے دوسروں کو خبردار کرتے کرتے خود اس کی زد میں آ گیا۔ میاں بشیر احمد کی وضعداری یہاں آ کر جواب دے گئی۔ بس اچانک ''ہمایوں'' سے ان کا جی بھر گیا۔ پرچہ بند۔ ناصر کی ادارت ختم۔

دوسری تبدیلی کا احوال بھی سن لیجئے۔ ناصر پرانی انارکلی کے نواح میں ایک گھر کے ایک کمرے میں گزر بسر کر رہا تھا۔ شادی سے پہلے اس رہائش میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ مگر شادی کے بعد یہاں رہائش مشکل ہو گئی تھی۔ ناصر کے ایک پرستار نے جو افسر قسم کی چیز تھے' کرشن نگر میں ایک اچھا خاصا کشادہ مکان اس کے نام الاٹ کرا دیا۔ اس تبدیلی سے ہم سب ہی دوست متاثر ہوئے۔ وہ اس طرح کہ ناصر رات کو اکیلا گھر جائے یہ تو کبھی ہوا ہی نہیں۔ رات کے جس پہر میں بھی واپسی ہوتی کبھی پوری ٹولی کا پوری ٹولی نہ سہی چند دوستوں کا یہ فرض ہوتا تھا کہ اسے دروازے تک چھوڑ کر آئیں۔ کرشن نگر ذرا دور کا علاقہ تھا۔ رات گئے ناصر کے ساتھ پیدل کرشن نگر

تک جانا' پھر وہاں سے پیدل یا سائیکل پر واپس گھر جانا کم از کم مجھے اکھرنے لگا تھا۔ ہاں اب ایک سہولت ضرور تھی' میری واپسی اکیلی نہیں ہوتی تھی۔ اب سعید محمود بھی ساتھ ہوتا تھا۔

میں نے جب بار بار ریگل کے موڑ پر آ کر کنی کاٹ کر اپنے گھر کی راہ لینے کی کوشش کی تو ناصر نے کہا کہ اچھا ٹولنٹن مارکیٹ تک میرے ساتھ چلا کرو۔ اس سے آگے میں خود چلا جایا کروں گا۔"

"ٹولنٹن مارکیٹ تک کیا خاص بات ہے۔"

ناصر کا جواب سننے سے پہلے اچھا ہو کہ لاہور سے باہر کے یار اس نکڑ کی اہمیت کو سمجھ لیں۔ مال روڈ پر یہ نکڑ ایک زمانے تک مخصوص اہمیت کا حامل رہا ہے۔ سمجھ لو کہ یہ پورا علاقہ ایک طرح کا کلچرل کمپلکس تھا۔ سامنے پنجاب یونیورسٹی' اس کے بلمقابل عجائب گھر اور نیشنل کالج آف آرٹس' اسی کے عقب میں پنجاب پبلک لائبریری۔ سامنے کافی ہاؤس۔ خود ٹولنٹن مارکیٹ کوئی بہت بڑا مارکیٹ نہیں تھا۔ انگریزوں کے وقتوں کی ایک عمارت تھی' جس میں چند جنرل سٹور اور کچھ مختلف قسم کی دکانیں قائم تھیں۔ سامنے ایک لمبا برآمدہ جس کے آخری گوشے میں جو پرانی انارکلی سے متصل تھا' ایک پان سگریٹ والا بیٹھتا تھا' جس کا دیا شاید رات بھر ہی ٹمٹماتا رہتا تھا۔ واپسی کے سفر میں ناصر کا یہ آخری پڑاؤ تھا۔ یہاں اسے رکنا ضرور تھا۔ رات کا آخری پان کھا کر اور نیا سگریٹ سلگا کر آگے بڑھتا تھا۔ تو میں نے ناصر کو جب بار بار یہ اصرار کرتے دیکھا کہ مجھے بس ٹولنٹن تک چھوڑ آیا کرو تو پوچھا کہ "ٹولنٹن کی نکڑ کی کیا تخصیص ہے؟"

جواب دیا "بات یہ ہے کہ رات کو جب میں ٹولنٹن کے نکڑ پہ پہنچتا ہوں تو سامنے اس نکڑ پہ جہاں بائبل سوسائٹی کی دکان ہے مجھے مولانا حالی کھڑے نظر آتے ہیں۔ گلے میں مفلر' ہاتھ میں چھڑی' اور لب پہ یہ شعر:

مجھے تنہا نہ سمجھیں اہل لاہور
میں اپنی ذات میں اک انجمن ہوں

وجہ معقول نظر آئی اور اب ہم نے جیسے یہ طے کر لیا ہو کہ کتنی بھی رات گزر گئی ہو' ناصر کا اس نکڑ تک ساتھ دینا ضروری ہے اور جب ناصر کو یہ نظر آیا کہ اس سے یہاں سے آگے اکیلے جانا ہے تو پھر اس نے اس کی ایک اور صورت نکالی۔ رفتہ رفتہ مجھے اس کا احساس ہوا کہ رات کے کسی پہر میں بھی ہم اس نکڑ پہ پہنچیں' یہاں ایک تانگہ کھڑا نظر آتا ہے اور تانگہ والا جیسے کسی کے انتظار میں بیٹھا اونگھ رہا ہو۔ ہمیں دیکھ کر وہ مستعد ہو جاتا۔ ناصر نے رات کا آخری پان کھایا' سگریٹ سلگایا اور بے کہے سنے تانگ میں جا کر بیٹھ گیا۔ اچھا تو گویا اس پان سگریٹ والے کے ساتھ ساتھ اس تانگہ والے سے بھی ناصر کی یاری ہو گئی تھی۔

کبھی کبھی میں اس تانگہ میں بیٹھ کر ناصر کے ساتھ کرشن نگر تک جاتا اور اسے گھر پہنچا کر اسی تانگہ میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا۔ سو رفتہ رفتہ میرا اس تانگہ والے سے تعارف ہوا۔ یہ جالندھر کا مہاجر تھا۔ زمانے سے اسے بہت شکایتیں تھیں۔ اردو کے شاعروں سے بھی زیادہ۔ ایک شکایت اسے ناصر سے بھی تھی۔ کہنے لگا ''ناصر صاحب جی تو وڈے آدمی ہیں۔''

میں نے کہا ''بالکل ہیں۔''

کہنے لگا ''گورنر سے ان کی اتنی دوستی ہے۔ روز وہ ان کے گھر پہ آتا ہے۔ میں نے ناصر صاب جی سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ گورنر سے میری سفارش کر دو۔ وعدہ بھی کر لیتے ہیں پر کرتے نہیں۔''

اس بیان پر میرے کان کھڑے ہوئے۔ پھر میں نے پوچھا ''تم کیا سفارش کرانا چاہتے ہو؟''

مگر یہ خود اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا سفارش کرانا چاہتا ہے۔ بس وہ یہ کہہ کے چپ ہو گیا ''اس کے قبضے میں تو سب کچھ ہے۔ ایک مرتبہ اس سے میرا ذکر تو کریں۔''

اس شکایت کے باوجود ناصر سے اس کا تعلق خاطر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ان اوقات میں مجال ہے کہ کسی اور سواری کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھے۔ بیشک گھنٹوں خالی کھڑا رہے' کھڑا رہتا تھا اور انتظار کرتا رہتا تھا۔

ہمایوں سے فراغت کے بعد ناصر کو عجب سوجھی۔ یہ کہ اپنا رسالہ نکالا جائے۔ پہلے میں نے یہ بات ایک کان سنی' دوسرے کان اڑا دی۔ جب وہ اس معاملہ میں سنجیدہ ہوتا چلا گیا تو میں نے پوچھا ''ناصر یہ پرچہ تم کیسے نکالو گے۔ اس کے لیے تمہارے پاس وسائل کہاں ہیں؟''

ناصر نے وسائل کے بارے میں کچھ اس طرح سے نقشہ کھینچا کہ مجھے خیال گزرا کہ اس نے واقعی مختلف ذرائع سے کچھ بندوبست کر لیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے۔ ناصر نے اشتہارات کے سلسلہ میں جو اپنے تعلقات کے حوالے سے معاملہ کی صورت بتائی تھی اس سے لگتا تھا کہ یہ رسالہ تجارتی طور پر بھی اتنا کامیاب رہے گا کہ ناصر کے لیے یہ ذریعہ روزگار بن جائے گا۔ گویا چپڑی اور دو دو۔ ادبی مقاصد کی بھی تکمیل ہو گی اور گھر کا خرچ بھی چلے گا۔

''اس کا نام ہم ''خیال'' رکھیں گے۔ گویا یہ ''خیال'' کا دوبارہ اجرا ہو گا۔''

''اچھا۔''

''اور یہ کہ تم میرے ساتھ ادارے میں شامل ہو گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے' مگر اچھی طرح سوچ لو۔ پھر تین پرچے نکالنے کے بعد بند نہ کرنا پڑے۔''

''خوب سوچ لیا ہے۔ اور تم تو صرف ایڈیٹر ہو' مینجمنٹ تو میرے پاس ہوگا۔ دیکھنا پرچہ کس ٹھاٹ سے نکلتا ہے اور کتنا بزنس لاتا ہے۔''

جب میں پوری طرح قائل ہوگیا تو میں نے کہا ''ایک تجویز میری ہے۔ یہ 1957ء ہے' ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں سن ستاون کی جنگ آزادی کی سوسالہ یاد منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کیوں نہ ہم مئی سے اپنے پرچے کا آغاز کریں اور پہلا پرچہ سن ستاون نمبر کے طور پر پیش کریں۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔'' ناصر نے فوراً ہی اس تجویز کو قبول کرلیا۔ ویسے تو شیخ صاحب نے بھی اس وقت اس تجویز پر صاد کردیا تھا اور سعید محمود تو فوراً ہی سرگرم عمل ہوگیا۔ شہر کی لائبریریاں تھیں اور وہ تھا۔ لائبریریوں کے کونوں کھدروں سے گرد میں اٹی کتابیں درباب سن ستاون ٹٹول ٹٹول کر برآمد کرتا اور ٹی ہاؤس میں شام کو جب ہم اکٹھے ہوتے تو میز پر کتابوں کا اتنا انبار ہوتا کہ بیرے کے لیے پیالیوں کا چننا ایک مسئلہ بن جاتا۔ یار گزرتے گزرتے حیران ہوکر کتابوں کے انبار دیکھتے اور پوچھتے ''تم لوگ ادبی پرچہ نکال رہے ہو یا تاریخ کی کتاب مرتب کر رہے ہو۔'' اور سعید محمود ثابت کرنے پہ تل جاتا کہ ایک ادیب کے لیے تاریخی شعور کا ہونا کتنا ضروری ہے۔

مگر یہ نوزائیدہ تاریخی شعور ہماری صحبت کو راس نہیں آیا۔ شیخ صاحب کا تاریخی شعور سن ستاون کی جنگ آزادی کے بارے میں کچھ اور ہی کہتا تھا۔ ان کا تاریخی شعور روز شام کو ہمارے تاریخی شعور سے اس شدت سے ٹکراتا کہ چائے کی میز پر سن ستاون برپا ہو جاتا۔ شیخ صاحب اتنے برہم ہوئے کہ انہوں نے ٹی ہاؤس ہی آنا چھوڑ دیا۔

مضامین کے ساتھ ساتھ کتنے شاعر دوستوں سے ہم نے سن ستاون کے حوالے سے نظمیں لکھوالیں۔

''مگر افسانہ اس موضوع پر کون لکھے گا۔'' ناصر نے سوال اٹھایا۔

''ہاں' افسانے کا مسئلہ ٹیڑھا ہے۔ افسانہ کون لکھے گا۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تم لکھو گے اور کون لکھے گا۔'' ناصر نے فوراً ہی مجھ پر کاٹھی ڈال دی۔

اس حوالے سے افسانے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرے دھیان میں یہ بات آئی کہ اگر اس عہد کی فضا کو گرفت میں لانا مقصود ہے تو افسانے کی نئی فارم کو سلام کرو اور داستان کی فارم کو برت کر دیکھو۔ سو اس واسطے سے میں نے اس فارم کو برتنے کی جرات

کی اور مختصر داستان ''جل گرجے'' کے عنوان سے لکھی۔ یوں اس فارم سے پہلی مرتبہ میرا ربط وضبط ہوا ورنہ شور تو میں خاصے پہلے سے مچا رہا تھا کہ ناول اور مختصر افسانے کی اصناف تو ہم نے مستعار لی ہیں۔ اظہار کی جو افسانوی صورتیں ہمارے جدی تجربوں سے پھوٹی تھیں وہ کہاں گم ہو گئیں۔

خیر تو خیال کا سن ستاون نمبر بڑی گرمجوشی سے مرتب ہو رہا تھا اور ساتھ میں اگلے پرچے کی تیاریاں بھی ہو رہی تھی۔ جن یاروں کو سن ستاون نمبر دار انہیں کھا رہا تھا وہ خیال کے اگلے پرچے کے لیے قلم تیز کر رہے تھے۔ شاید سب سے پرجوش شاکر صاحب تھے جن کی تصویر تو بعد میں ملنی تھی۔ ایک مضمون انہوں نے اپنے تخلیقی تجربے کے حوالے سے گرما گرمی میں لکھا اور ہمارے حوالے کیا۔

مگر ہوا کیا۔ پرچہ مرتب ہو گیا۔ کتابت کے مرحلے سے بھی گزر لیا۔ مگر مئی کا مہینہ تیزی سے گزر رہا تھا اور پرچے کا دور دور پتا نہیں تھا۔ اب ناصر کے مینجمنٹ کی نزاکتیں ہم پر منکشف ہونی شروع ہوئیں۔ اس نے سرمائے کا جو انتظام کیا تھا۔ اس کی حقیقت بھی اب سامنے آئی۔ خدا خدا کر کے کاغذ کا انتظام ہوا۔ مگر ابھی تو طباعت کا مرحلہ درپیش تھا۔ آخر سودا یہ ہوا کہ پرچہ چھاپ دو۔ مہینے کے اندر اندر پرچہ بک جائے گا اور ہم بل ادا کر دیں گے۔ مگر پرچہ چھپ کر کہیں آخر جون میں آیا۔ اس وقت مارکیٹ سن ستاون کے حوالے سے کتابوں اور رسالوں کے خصوصی نمبروں سے لبریز ہو چکا تھا۔ پھر شہر سے باہر کے آرڈروں کی تعمیل کیسے ہو۔ بس ہم ہی سنتے رہے کہ بہت آرڈر آئے ہیں اور پارسل دمادم بھیجے جا رہے ہیں۔ آخر میں ہوا یہ کہ سارا پرچہ اونے پونے ''آئینہ ادب'' کے ہاتھ بیچ دیا گیا۔ پریس کا بل کچھ اس رقم سے ادا ہوا کچھ ہم نے غلام علی اینڈ سنز کے لیے ایک دو کتابیں مرتب کر کے معاوضہ وصول کیا اور پریس کا حساب بے باق کیا۔ ابن انشا نے کہا کہ یار تم نے جب پہلی مرتبہ ''خیال'' نکالا تھا تو اشتہار میں اعلان کیا تھا کہ اس پرچے کا ایک ایڈیٹر بھی ہوگا۔ جب تیسری مرتبہ ''خیال'' نکالنے کا خیال دل میں لاؤ تو اشتہار میں اعلان کرنا کہ اس پرچے کا ایک ناشر بھی ہوگا۔

سن ستاون کی جنگ آزادی میں بھی شکست ہی تو ہوئی تھی شکست اس حوالے سے ناصر کا بھی مقدر ٹھہری۔ ''خیال'' نکالنے کا خیال اس نمبر کی اشاعت کے ساتھ ہی خواب بن گیا۔

بہر حال ہم نے جیسے تیسے کر کے سن ستاون کی یاد تو منا ہی لی۔ اس واسطے سے ماضی کی تھوڑی خوشبو بھی اپنے میں رچا بسالی' مگر عسکری صاحب نے اس موضوع پر لکھتے لکھتے ماضی کے ساتھ حاضر کا ٹانکا لگا دیا۔ ''1957ء میں دنیا کے مسلمانوں کو جو سنگین مسائل درپیش ہیں ان کے سامنے 1857ء کیا مال ہے۔'' اور یہ کہ ''1957ء میں ہماری آزمائش 1857ء سے بھی کڑی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم 1958ء کے عذر سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں۔''

مگر آزمائشوں نے 1957ء سے گزر کر 1958ء میں زور پکڑا اور عرب دنیا کا تو یہ حال تھا کہ جیسے اسے کسی بڑے انقلاب نے آلیا ہو۔ کتنے عرب ملکوں میں انقلاب آچکا تھا۔ کتنے ملکوں کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ جمال عبدالناصر کا عرب نیشنلزم ایک انقلابی قوت بن کر مغربی سامراج کو للکار رہا تھا۔ اسے سوویت روس کی حمایت و تائید حاصل تھی۔ لیجئے اس چکر میں ہمارے عسکری صاحب کی بھی کایا پلٹ ہوگئی۔ کہاں وہ سوویت روس کے نام سے بدکتے تھے' کہاں اب وہ اس کا کلمہ پڑھتے نظر آتے تھے۔ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ عرب سوویت روس کی مدد سے امریکہ اور اس کے حلیفوں سے ایسی ٹکر لیں گے کہ انہیں چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ سو اب انہیں سوویت روس کی ناگوار باتیں بھی گوارا تھیں۔ ہنگری میں اس کی فوجی کاروائی کی وجہ سے سارتر جیسے روس دوست بھی اس سے فرنٹ ہوگئے تھے' مگر عسکری صاحب نے اس کاروائی کا بھی جواز ڈھونڈ لیا تھا۔

ہاں انہی دنوں قیوم صاحب یونسکو کی معرفت یورپ کا ایک دورہ کر کے واپس آئے تھے اور ٹی ہاؤس میں یاروں کے بیچ بیٹھ کر سارتر سے اپنی ملاقات کا احوال سنا رہے تھے۔ یہ ملاقات تھی بس یوں سمجھو کہ

''جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا ادھر گیا''

سارتر نے ان دنوں ہنگری کے حق میں مہم چلا رکھی تھی۔ قیوم صاحب سے ملاقات ہوئی تو چھوٹتے ہی پہلا سوال کیا کہ ''ہنگری میں روس کی فوجی کاروائی کے بارے میں آپ کا ردعمل کیا ہے۔''

قیوم صاحب نے جواب دیا ''میں تو شاعر ہوں' سیاست سے واسطہ نہیں رکھتا۔''

''مگر میرا تو اس وقت مسئلہ ہنگری ہے۔''

بس اسی پہ سلام علیکم وعلیکم السلام ہوگئی۔

قیوم صاحب کی دلیل سننے کے لیے عسکری صاحب بھی تیار نہیں تھے۔ اس کا مسئلہ عربوں کی جدوجہد تھی اور سب سے بڑھ کر الجزائر کی فرانسیسی سامراج کے خلاف مزاحمتی جنگ۔

ویسے تو ہماری ادبی دنیا میں پہلے ہی سے سارتر کا طوطی بول رہا تھا۔ ایلیٹ پاؤنڈ تو اب اردو والوں کے لیے نئے پرانے ہو چکے تھے۔ اب ٹی ہاؤس کی میزوں پر سارتر اور کامیو کا سکہ چلتا تھا' مگر الجزائر کی جدوجہد کے بارے میں کامیو کے موقف نے اسے فرانس کے دانشوروں کے بیچ ہی خوار نہیں کیا۔ وہ پاکستان میں بھی کم از کم عسکری صاحب کی نظروں میں تو بہت گر گیا۔ ہاں الجزائر کی حمایت نے عسکری صاحب کو سارتر کا اور زیادہ گرویدہ بنا دیا۔ اور پاکستان میں اب سبط حسن سے ان کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ سوویت روس

پیارا تو سوویت روس کے نیاز مند بھی پیارے۔ اب جو چھٹیوں میں کراچی سے لاہور آئے تو ''لیل ونہار'' کے دفتر کے پھیرے لگنے لگے۔ بس انہیں ملاقاتوں سے یہ شگوفہ پھوٹا کہ ادیبوں کی طرف سے یوم الجزائر منایا جائے۔

''پاکستان ٹائمز'' کے دفتر میں فیض صاحب کے کمرے میں گنے چنے ادیب جمع ہوئے' دونوں رنگ کے۔ کچھ ترقی پسند' کچھ رجعت پسند۔ باقی ایسے کہ نہ رجعت پسند میں نہ ترقی پسندوں میں۔ گویا نہ بدنام نہ نیک نام۔ یہی جیسے سید امتیاز علی تاج اور آفتاب احمد خاں۔

یوم الجزائر کے منانے کے سلسلے میں جو کمیٹی بنائی گئی اس کے صدر فیض صاحب' سیکرٹری یہ خاکسار' باقی اراکین میں دو کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ اعجاز حسین بٹالوی اور حمید اختر۔

میں ٹی ہاؤس بعد میں پہنچا۔ یہ خبر پہلے پہنچ گئی۔ یاران حلقہ نے کہا کہ اچھا انتظار حسین ترقی پسند ہو گیا۔ ہماری نئی نسل والی ٹولی نے کہا کہ اچھا تو تم نے پرانی نسل کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ ادھر یو ایس آئی ایس میں جو صحافی دوست بیٹھے تھے ان کی نظروں میں ایک دم سے ہمارا چال چلن مشکوک ہو گیا۔ اس ادارے میں راز صاحب خوب بزرگ تھے۔ انہیں مجھ سے مجھے ان سے تعلق خاطر چلا آتا تھا۔ میں نے ہزار الجزائر کے مسلمانوں کے مصائب و آلام کے واسطے دیئے' مگر کوئی قائل نہ ہوا۔ اس زمانے میں کیا الجزائر کی جدوجہد آزادی' کیا عربوں کی سامراج کے چنگل سے نکلنے کے لیے جدوجہد' ان سب کی حمایت کو اشتراکیت کے خانے میں ڈالا جاتا تھا۔

خیر تو چار چھ دن ہمیں بھی فیض صاحب کی ہدایت میں کام کرنے کا فریضہ ادا کرنا پڑا۔ دوسرے تیسرے دن ان کے دفتر میں حاضری دینا' ان سے ہدایات لینا اور جلسہ کی تیاری کے لیے دوڑ دھوپ کرنا' مگر آخر میں آ کر عجب ہوا۔ جلسہ سے ایک دن پہلے میں نے فیض صاحب کو فون کیا۔ پتا چلا کہ وہ تو کراچی گئے ہیں اور ہفتے بعد آئیں گے۔ میرے قدموں تلے سے تو زمین نکل گئی۔ کل جلسہ ہے۔ میں اکیلا کیا کروں گا۔ ویسے بھی جلسے کرنے کرانے کا میرا تو کوئی تجربہ ہی نہیں تھا۔ میں تو فیض صاحب کے سہارے چل رہا تھا۔ بس میں نے ایک عقلمندی دکھائی اور یہ نکتہ مجھے عسکری صاحب نے سمجھایا تھا کہ مدعوین کو بتانا مت کہ فیض صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ یہی میں نے کیا۔ جلسہ کی صدارت کے لیے ایک پریذیڈیم بنایا گیا تھا۔ میاں بشیر احمد' مولانا غلام رسول مہر اور سید امتیاز علی تاج کو گویا مل کر صدارت کرنی تھی۔ میں نے تینوں میں سے کسی کے کان میں یہ بھنک نہیں پڑنے دی کہ جس نے آپ کو صدارت کی دعوت دی تھی وہ جلسہ میں نہیں ہوگا۔ خیر مہر صاحب نے تو جلسہ میں آ کر پوچھا ہی نہیں کہ فیض صاحب کہاں ہیں۔ میاں بشیر احمد نے

پوچھا تو میں نے سرسری کہہ دیا کہ انہیں کسی ضروری کام سے آج کراچی جانا پڑ گیا۔ انہوں نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ ردعمل کا اظہار تاج صاحب کی طرف سے ہوا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی اردگرد نظر ڈالی۔ استقبال کرنے والوں سے مصافحہ کیا۔ پھر پوچھا' بھئی فیض کہاں ہے۔ میں نے ان سے بھی سرسری کہا کہ انہیں کسی ضروری کام سے آج کراچی جانا پڑ گیا۔ اس پر وہ کسی قدر برہمی سے بولے عجب آدمی ہے۔ ہمیں پھنسا کر خود کراچی چلا گیا۔ مگر صدارت کی خالی کرسی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے انہیں زیادہ برہمی کا موقعہ نہیں دیا۔

مقالہ نگاروں میں سرفہرست مولانا صلاح الدین احمد تھے۔ مگر ان کا مسئلہ فیض صاحب تھے ہی نہیں' بلکہ ہوا یوں کہ ابتدائی میٹنگ میں انہیں بلانے کے لیے عسکری صاحب اور سبط صاحب دونوں نے میری ڈیوٹی لگائی تھی کہ تم جا کر مولانا سے میٹنگ میں آنے کی گزارش کرو' مگر میری گزارش کا جواب مولانا نے یہ دیا کہ بہت نیک کام ہے' جب جلسہ کرو گے تو میں حاضر ہوں گا اور مقالہ بھی پڑھوں گا' مگر یہ میٹنگ جس جگہ ہو رہی ہے وہاں میں حاضری دینے سے معذور ہوں گا۔

بہرحال جلسہ بہت دھوم سے ہوا۔ الجزائر کی جدوجہد سے جذباتی تعلق ادیبوں کے سوا بھی ایک خلقت کو یہاں کھینچ کر لے آیا تھا۔ وائی ایم سی اے ہال میں جب تل دھرنے کی جگہ نہ رہی تو ہال کے باہر برآمدے میں اور صحن میں اور سیڑھیوں سے نیچے تک مجمع پھیلتا چلا گیا۔

فرانسیسی تسلط کے خلاف الجزائریوں کی جدوجہد نے بہادری اور مزاحمت کی ایک مثال قائم کی تھی۔ ویت نام کے بعد مزاحمت کا یہ دوسرا بڑا استعارہ تھا جو بیسویں صدی کے بیچ ایشیائی افریقی دنیا کو میسر آیا تھا۔ اردو ادب نے بھی اس استعارے کو گرمجوشی سے اپنایا۔ ادبی رسالوں میں ان دنوں یہ موضوع عام تھا' شاید اس استعارے نے شاعروں کو زیادہ گرمایا۔ یوں کہانیاں بھی لکھی گئیں۔ ڈھائی تین کہانیاں میں نے بھی باندھیں' مگر پھر میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ یہ محض فرض کی ادائیگی تھی یا ان کہانیوں کی ادبی قیمت بھی ہے۔ اگر فرض کی ادائیگی مقصود تھی تو وہ تو رسالوں میں اشاعت سے پوری ہو گئی۔ پھر انہیں ادبی کاوشوں کے طور پر مجموعہ میں کیوں شامل کیا جائے۔

ہاں اسی زمانے میں فرانس میں ایک کتاب "Question" کے نام سے شائع ہوئی جس نے بہت شہرت پائی۔ یہ ایک فرانسیسی کی اپنی روئیداد تھی' جسے الجزائری جدوجہد سے وابستگی کی بنا پر تشدد کے عمل سے گزرنا پڑا تھا جو فرانسیسی فوج کے ہتھے چڑھ جانے والے الجزائریوں کی تقدیر تھی۔ سارتر نے اس پر ایک زبردست دیباچہ لکھا۔ جب یہ کتاب انگریزی میں ترجمہ ہو کر پاکستان

پہنچی تو اصل کتاب کا ترجمہ ظفر صمدانی نے کیا۔ سارتر کا دیباچہ میں نے ترجمہ کیا۔ سعید محمود نے اپنے والد کے ادارے کے طرف سے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

اس وقت کسے معلوم تھا کہ اتنے ارمانوں اور اتنے دکھ بھوگنے کے بعد آزادی میسر آنے کو ہے وہ آگے چل کر کیا رنگ لائے گی اور الجزائریوں کو خود اپنوں ہی کے ہاتھوں کیسے بھیانک تشدد سے دو چار ہونا پڑے گا۔ اصل میں شادی اور آزادی کا معاملہ ایک سا ہے۔ دونوں ہی کام بڑے ارمانوں کے ساتھ انجام پاتے ہیں' مگر کچھ پتا نہیں ہوتا کہ اس کے بعد یہ ارمان پروان چڑھیں گے یا ان کا خون ہوگا۔ پاکستان کا خواب دیکھنے والوں کو بھی کب پتا تھا کہ بہت جلد وہ وقت آئے گا کہ خواب کی تعبیر الٹی ہو جائے گی۔ وہ لوگ اچھے رہتے ہیں جو خواب کی تعبیر کی چکا چوند میں دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ جو خواب انہوں نے دیکھا تھا وہ بحمد اللہ پورا ہو گیا۔ اذیت ان کے حصے میں آتی ہے جو تعبیر کو الٹتے ہوئے دیکھنے کے لیے زندہ رہتے ہیں۔ جلدی گزر جانے کے اپنے فائدے ہیں۔ زیادہ زندہ رہنے کی اپنی اذیتیں ہیں' تو انہی دنوں پاکستان کی سیاست کا بھی نقشہ الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ مگر آنے والے وقت کا شاید کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا۔

◆◆◆

مارشل لا کا آنا اور ادیبوں کے دن پھرنا

زمانہ قیامت کی چال چل گیا۔ مارشل لا لگ گیا۔ آنے والے انتخابات کی گہما گہمی ختم' جلسے جلوس بند' لب بند' زباں بند' اخباروں پہ اوس پڑ گئی' لیڈروں کی بیان بازیاں قصہ ماضی ہوئیں۔ اب اخبارات میں ان کی جگہ مارشل لائی احکامات نے لے لی تھی۔

کافی ہاؤس میں ایک تختی نصب کر دی گئی۔ حضرات سیاسی گفتگو سے اجتناب کریں۔ شام کو میں ٹی ہاؤس پہنچا تو معمول کے خلاف خاموشی کا سماں تھا۔ باتیں ہو رہی تھیں مگر بہت احتیاط کے ساتھ۔ کوشش کہ مارشل لا کو موضوع بحث نہ بنایا جائے' مگر پھر یوں ہوا کہ کسی نے مارشل لا پر کوئی اڑتا سا تبصرہ کیا۔ کسی نے گول مول فقرہ کہا۔ کسی نے اشاراتی انداز میں کوئی بات کی۔ رفتہ رفتہ حجاب اٹھتا گیا۔ اور جب گیارہ بجے کے قریب ٹی ہاؤس بند ہو رہا تھا تو بحث اپنی عروج پر تھی کہ مارشل لا صحیح لگا ہے یا غلط لگا ہے۔

اگلے دن شام کو جب ہم جمع ہوئے تو دفعتاً حسن لطیفی ایک اشتہار قسم کی چیز ہاتھ میں لیے داخل ہوئے۔ ہم سے منہ موڑ کر سوتے ہوئے سامنے آویزاں بلیک بورڈ کے پاس گئے۔ اس پر اشتہار چسپاں کیا' پھر بیرے سے کچھ بات کی۔ وہ لپک جھپک اندر گیا اور دو توس لے کر پلٹا۔ لطیفی صاحب نے توس لیے اور خاموشی سے باہر نکل گئے۔ باہر ایک کتا ان کا انتظار کر رہا تھا۔

ان کے جانے کے بعد ہم نے بلیک بورڈ پر جا کر دیکھا کہ کیا اشتہار ہے۔ یہ لطیف صاحب کی تازہ ترین نظم تھی۔ عنوان تھا۔

''واقعہ خوب ہوا' خوب ہوا' خوب ہوا''

ساتھ میں جنرل ایوب خاں کی وردی میں تصویر۔

یہ شاعر کی طرف سے مارشل لا کا خیر مقدم تھا اور ایوب خاں کو خراج تحسین۔

تیسرے چوتھے دن انجم رومانی غزل لکھ کر لائے۔ اس کا لہجہ دوسرا تھا۔

بیدار اہل قافلہ سونے کے دن گئے
ہشیار آگ میں ہے یہ جنگل گھرا ہوا
ہاں دیکھ کر ذرا کہ اندھیرا ہے راہ میں
ہاں تیز تر قدم کہ ہے بادل گھرا ہوا

اس دور کی بساط پہ ہر شاہ کو ہے مات
گھبرایئے نہ دیکھ کے پیدل گھرا ہوا

انجم صاحب سیدھے سادھے آدمی' جلدی گھبرا جاتے تھے۔ یاروں نے انہیں ڈرایا ''انجم صاحب پکڑے جاؤ گے۔ یہ تو مارشل لا کے خلاف غزل ہے۔''

انجم صاحب بہت پریشان ہوئے۔ وہ تو یہ غزل ''لیل ونہار'' میں چھپنے کے لیے دے آئے تھے۔ فوراً وہاں گئے۔ غزل کے نیچے نوٹ لکھ آئے۔ ''یہ غزل 7 اکتوبر 1958ء سے پہلے لکھی گئی تھی۔''

جب پرچہ چھپ کر آیا اور یاروں نے یہ نوٹ پڑھا تو انہوں نے انجم صاحب کو مزید ڈرایا ''انجم صاحب یہ نوٹ دے کر تو آپ نے مارشل لا حکام کو دعوت دی ہے کہ اس غزل کو پڑھو۔ وہ تو اب اس غزل کو خاص طور پر پڑھیں گے۔''

قینچی کا سگریٹ پینا' کھانسنا اور غزل لکھنا..... انجم صاحب کے یہ تین محبوب مشغلے چلے آتے تھے۔ وضع کے ایسے پکے کہ نہ کبھی سگریٹ کا برانڈ بدلا' نہ کھانسنا بند ہوا' نہ غزل کا رنگ بدلا۔ یہ بھی نہیں کہ وقت کے ساتھ زیادہ پختگی آ جائے۔ پختگی کیا آتی شروع ہی سے پختہ چلے آ رہے تھے۔ سو حلقہ والوں نے استاد انجم رومانی کہنا شروع کر دیا تھا۔ انجم صاحب اس ماموں کے بھانجے تھے جس نے نجومی ہونے کے ناتے ستاروں کے حساب سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ انہیں بادشاہ بننا ہے' بھانجا نجومی تو نہیں بنا' مگر فلکیات میں قدم رکھتا تھا۔ ویلی کوفسکی سے شغف مستزاد۔ ویلی کوفسکی کی سائنسی بحثوں کے حوالے سے ستاروں کا حساب کر کے ہمیں بتاتے کہ طوفان نوح کب آیا تھا اور آسمان سے پتھر کب اور کس طرح برسے تھے۔ مذہبی صحیفوں میں جو معجزے بیان ہوئے ہیں ان سب کو سائنسی سچائیاں بتاتے اور ویلی کوفسکی کا حوالہ دے کر دودھ کا دودھ' پانی کا پانی کر دیتے۔

کٹر مذہبی آدمی ایسے کہ اگلے پچھلے جس بزرگ' جس قاضی مفتی مولوی' جس عالم دین کا نام لیا فوراً فتوی جاری کہ وہ تو مسلمان ہی نہیں تھا۔ نماز کا احوال اللہ جانے مگر روزہ ہم نے انہیں پابندی سے رکھتے دیکھا۔ رمضان کے ایام میں اتوار کے دن جب حلقہ کے جلسہ میں شرکت کے لیے آتے تو جیب میں ایک ٹماٹر ڈال کر بھی لاتے۔ وہ ٹماٹر بیرے کے حوالے کیا جاتا۔ جب حلقہ کا جلسہ ختم کر کے ٹی ہاؤس میں آ کر بیٹھتے تو اس ایک ٹماٹر کا سوپ ان کے سامنے آ جاتا۔ کسی کسی اتوار کو ایک انڈا بھی ساتھ لاتے۔ ٹماٹر کے سوپ کے ساتھ ابلا انڈا۔ یہ گویا خصوصی افطاری کا اہتمام ہوتا۔

سخت اکل کھرے' حلقہ میں مشکل ہی سے کسی سے ان کی بنتی تھی۔ ہنسنے مسکرانے سے سخت پرہیز۔ مگر ہجو اور ہزل لکھنے میں طبیعت

ہمیشہ حاضر دیکھی گئی۔ مبارک احمد کی شادی پر سہرا کہا کچھ اس رنگ کا

اس کی خالہ کا خدا حافظ ہے
جس کا خالو ہو مبارک احمد

صفدر میر کے رنگ ڈھنگ دیکھے تو طبیعت رواں ہوگئی۔ شعر کہا:

دیکھنا رکھیو نہ کوئی در کھلا
پھر رہا ہے شہر میں صفدر کھلا

انہی دنوں اسی فضا میں ناصر نے ایک تازہ غزل لکھی۔

ان سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے
کبھی تم بھی سنو یہ دھرتی کیا کچھ کہتی ہے
یہ ٹھٹھری ہوئی لمبی راتیں کچھ پوچھتی ہیں
یہ خامشی آواز نما کچھ کہتی ہے

اور مقطع یہ تھا۔

ناصر آشوب زمانہ سے غافل نہ رہو
کچھ ہوتا ہے جب خلق خدا کچھ کہتی ہے

لیکن ادبی فضا دیر تک سہمی ہوئی نہیں رہتی۔ جلد ہی کراچی سے ایک شگوفہ پھوٹا اور لاہور کے سارے ادیبوں کی نظریں کراچی کی طرف لگ گئیں۔ اس شہر سے کہ ملک کا اس وقت تک صدر مقام تھا۔ سات ادیبوں کا ایک بیان جاری ہوا جس میں مارشل لا کا خیر مقدم کرتے ہوئے نئے حاکموں سے ادیبوں کی بہبود کے لیے کچھ کرنے کی اپیل کی گئی تھی اور یہ ادیب ایسے ویسے نہیں تھے۔ ان میں غلام عباس اور قرۃ العین حیدر بھی شامل تھیں اور اس بیان کے فوراً بعد خبر آئی کہ کراچی میں ادیبوں کا ایک کل پاکستان کنونشن ہوا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کراچی سے یاروں کو بلاوے آنے لگے۔ جس کے نام دعوت نامہ آ گیا وہ نہال ہوگیا' جسے دعوت نامہ نہ ملا اس نے سر پہیہ پیر گاڑی ایک کر دیا اور دعوت نامہ حاصل کر کے دم لیا۔ ادھر جمیل الدین عالی اپنے وقت کے حاتم بنے ہوئے تھے۔ کوئی اس در سے نامراد نہیں پھرا۔ جس نے جھوٹوں کہہ دیا کہ بندہ بھی لکھتا ہے۔ اس کا نام زمرہ ادبا میں درج ہوا اور دعوت نامہ جاری ہوگیا اور اس

ہنگام پتا چلا کہ لکھنے کی قسمیں ہیں اور ادب کی کتنی فرعیں ہیں۔ اس پر انجم رومانی نے ''رائٹر نامہ'' (بروزن آدمی نامہ) کے عنوان سے ایک ہجو لکھ ڈالی جس کی تان یہاں آ کر ٹوٹی کہ

''ٹائپ جو کر رہا ہے سو ہے وہ بھی رائٹر''

بات یہ ہے کہ ادیب کہلانے کو کس کو جی نہیں چاہتا اور اب تو معاملہ ہی ایسا آ پڑا تھا۔ سمجھ لو کہ ادب ذریعہ عزت بننے لگا تھا۔ سو ادیب بننے کے لیے اس آن جی کچھ زیادہ ہی تلملانے لگا

''تپش شوق نے ہر ذرے پہ ایک دل باندھا''

جسے دیکھو دعوت نامہ در بغل ادیب ہونے کا مدعی ہے اور کراچی جانے کے لیے پر تول رہا ہے۔

روانگی سے ایک دن پہلے ٹی ہاؤس میں کرایوں کی رقم تقسیم ہوئی۔ جسے رقم ملتی تھی وہ فوراً سٹیشن کی طرف دوڑتا تھا کہ جلدی سے سیٹ ریزو کرا لے۔

ناصر نے چائے پیتے پیتے عجب فقرہ کہا ''انتظار' یہ ہم دربار شام میں جا رہے ہیں۔'' دل میں پہلے ہی چور تھا۔ اس فقرے نے ایسی تصویر دکھائی کہ میں تھوڑی دیر کے لیے بالکل ہی گڑبڑا گیا۔ پھر میں نے ہمت کی اور کہا ''یار کرایہ وصول کر لینے میں کیا قباحت ہے۔ جانے پہ دل نہ ٹھکے تو کرایہ واپس کیا جا سکتا ہے۔''

شہرت بخاری نے یہ بات سنی اور صفدر میر کے کان میں جا پروئی کہ یہ دو آدمی اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کھڑی کرنے کے چکر میں ہیں۔ صفدر نے لال پیلی نظروں سے ہمیں دیکھا۔ واضح ہو کہ ان دنوں صفدر سے ہم سب ہی یاروں کی گاڑھی چھن رہی تھی' مگر صفدر کا پتا تھوڑا ہی ہوتا تھا کہ کب کس گھڑی آنکھ پہ میل آ جائے۔ اور اقبال کے مرد مومن والی شان کہ اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق۔ عمیق ہو یا نہ ہو شدت اس میں بہت ہوتی تھی۔ دوستی ہوئی تو ایسی کہ تن کے کپڑے اتار کے دے دیئے۔ لڑائی ہو گئی تو پھر اس سے برا کوئی نہیں۔ اور لڑائی کے لیے کسی لمبی چوڑی وجہ کی ضرورت تھوڑا ہی پڑتی تھی۔ کسی ننھی سی بات سے شک کا ایک پہاڑ کھڑا ہو جاتا اور پھر لڑائی سی لڑائی' جیسا میرے ساتھ ہوا۔ وہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ خیر میں بھی ایسا کون سا فرشتہ ہوں۔ لڑنے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ وقتاً فوقتاً میرا بھی چاہتا ہے۔ آخر لڑنا بھی تو ظالم و جاہل انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے۔ ہاں یہ ہے کہ آدمی دیکھ کر لڑنا چاہیے۔ عزت داروں کا آئین جنگ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ لڑنے سے پہلے دیکھ لیتے ہیں کہ جس سے لڑ رہے ہیں اس کی اپنی بھی کوئی عزت ہے۔ پھر صفدر سے لڑنے میں مجھے ایک اور سہولت بھی نظر آئی۔ ذاتی لڑائی لڑنا کچھ بھلی بات نہیں لگتی۔ صفدر صاحب میں

صفت یہ تھی کہ وہ ذاتیات کو نظریاتی رنگ دے دیتے تھے۔ اس سے لڑائی میں ایمان اور کفر کی جنگ والی شان پیدا ہو جاتی تھی۔

صفدر صاحب کو ہر رجعت پسند شے سے نفرت تھی' معہ اپنی شاعری کے۔ یہاں سے ان کے یہاں ایک تضاد کی صورت جنم لیتی ہے' وہی جو انہوں نے سلیم احمد کے یہاں دریافت کی ہے کہ ''اکثر نظریہ ساز ادیبوں کے یہاں نظریہ بھی ہوتا ہے اور تخلیق بھی' مگر دونوں ایک دوسرے سے روٹھے رہتے ہیں' آپس میں بات چیت نہیں کرتے۔ ہم اپنا منہ ادھر کر لیں تم اپنا منہ ادھر کر لو والا معاملہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ سلیم احمد صاحب کا طور ہے۔ وہ اسلامی ادب کے بڑے زبردست مبلغ رہے ہیں اور ہیں' لیکن خود اپنے فارمولے کے مطابق اسلامی ادب پیدا کرنے کے قائل نہیں معلوم ہوتے۔'' ٹھیک کہا' ویسے اس بیان کو صفدر کی آپ بیتی بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہاں بھی نظریہ اور تخلیقی تجربہ ایک دوسرے سے روٹھے نظر آتے ہیں۔ نظریہ مارکسی انقلاب' مگر دل اپنا پرانا پاپی ہے۔ بادلیر سے لے کر میراجی تک ہر زوال پسند پر ریجھا ہوا ہے۔ نتیجہ کیا نکلا۔ یہی کہ قسمت کے مارے ممتاز حسین ایک روز ٹی ہاؤس آ نکلے۔ احمد مشتاق نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور ان پر واضح کیا کہ ترقی پسندوں میں کوئی کھرا شاعر ہے تو وہ صفدر میر ہے۔ ممتاز حسین کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ویسے تو خود مشتاق کا معاملہ بھی سلیم اور صفدر والا ہی تھا۔ وہ عزیز دوسروں کی شاعری میں سیاسی شعور ٹٹولتا رہتا تھا جو بالعموم اسے وہاں دستیاب نہیں ہوتا تھا اور اس بنا پر وہ شاعر مردود و مقہور ٹھہرتا تھا۔ مگر خود مشتاق نے اپنی غزل کو ہر قسم کی سیاسی آلائش سے پاک رکھا اور خالص شاعری کی۔ اور مجھے دیکھو کہ میں ان تینوں دوستوں کی سیاست سے بے تعلق مگر تینوں کی شاعری کا شیدا۔ صفدر سے بہت لڑائی رہی۔ اس کی شاعری سے کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔

بہر حال ان دنوں صفدر صاحب سے ہماری گاڑھی چھنتی تھی۔ انارکلی کے ایک ہوٹل میں ان کا ڈیرا تھا۔ ٹی ہاؤس سے چار قدم کا فاصلہ تھا۔ سو وقت بے وقت ٹی ہاؤس سے نکلے اور صفدر صاحب کے ڈیرے پر۔ دوپہر ہوئی تو اسی دسترخوان پہ کھانا کھایا' وہیں تھوڑی سی کمر لگالی۔ پاکستان کے حالات جس تیزی سے بدل رہے تھے اس کے سبب مجھے اب ان کی شاعری کے ساتھ ان کے سیاسی تجزیوں پر بھی اعتبار آنے لگا تھا۔ سو جب رائٹرز کنونشن کا شگوفہ پھوٹا تو میں نے بطور خاص ان کی سیاسی بصیرت سے استفادے کی کوشش کی۔ اصل میں ہم سب ہی یاروں کو وسوسہ تھا کہ یہ کنونشن کیوں ہو رہا ہے؟ آگے چل کر کیا گل کھلائے گا۔ ادھر مولانا صلاح الدین احمد نے کرتا دھرتاؤں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں اس تقریب میں شرکت نہیں کروں گا۔ صفدر صاحب کا کہنا تھا کہ اس کے معنی و مطلب کچھ بھی ہوں مگر اس میں شرکت ضرور کرنی چاہیے۔ وہ اپنے حساب سے کہہ رہے تھے۔ ہمارے حساب میں بھی بال آخر اس

کام میں شریک ہونا ہی نکلا۔

ٹی ہاؤس سے ساتھ چلے تھے۔ کراچی جا کر کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔ وہاں سارے ترقی پسند اسی حساب سے آئے بیٹھے تھے' جس حساب سے صفدر صاحب گئے تھے۔ تو ان کی پرواز ان کے ساتھ۔ میں کنونشن کے افتتاحی اجلاس سے نکل کر عسکری صاحب کی طرف ہولیا۔ ادھر ایک نیا اختلاف پھوٹ پڑا تھا' مگر اس کا مجھے ایک دن پہلے ہی پتا چل گیا تھا۔ ایک دن پہلے میری شاہد صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کے یہاں اس بات پر بہت تلخی نظر آ رہی تھی کہ کنونشن میں وہ تو شریک ہو رہے ہیں' مگر عسکری صاحب نے ان کا بھی منہ نہیں کیا اور کنونشن میں شریک ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ ویسے عسکری صاحب نے ساقی سے رشتہ پہلے ہی توڑ لیا تھا جب اس کا روس نمبر نکلا تھا' یعنی اینٹی روس نمبر۔

عسکری صاحب کب سے مجھے لکھ رہے تھے کہ ایک پھیرا کراچی کا لگاؤ۔ اب میں وہاں پہنچا تو کس رکھائی سے ملے۔ میں سمجھ تو گیا مگر چپ رہا۔ رفتہ رفتہ کھلے بولے ''میں سمجھ رہا تھا کہ تم اور ناصر نہیں آؤ گے۔''

میں نے کہا کہ شرکت سے انکار کا شرف لاہور والوں میں سے تو بس مولانا صلاح الدین احمد نے حاصل کیا۔ باقی ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے سب ہی یہاں کھنچے چلے آئے ہیں' مگر آپ کی نیت کا حال تو ہمیں بالکل معلوم نہیں تھا۔''

بولے ''ہاں' وہ تمہارے ابن الحسن میرے پاس آئے تھے۔ میں نے کہا کہ آ جاؤں گا۔ پولیس کو بھیج کے بلوا لینا۔''

پھر عسکری صاحب نے سلیم کو بھی بلوا بھیجا۔ ہم نومبر 1947ء کی ایک ٹھنڈی صبح مغلپورہ کے سٹیشن پر ایک دوسرے سے بچھڑے تھے۔ اب گیارہ برس بعد مل رہے تھے۔ پھر ہم آپس میں ایسے مگن ہوئے کہ کنونشن کو بھول ہی گئے۔ پھر میں نے اختتامی اجلاس ہی میں جا کر ایوب خاں کے خطبہ کو سننے کا شرف حاصل کیا۔

سلیم کو تو 1947ء میں جیسا چھوڑا تھا اب بھی ویسا ہی پایا' مگر وہ جو اس ٹولی کا دوسرا جوان تھا' جمیل خان اور جس نے آگے چل کر جمیل جالبی کے نام سے اپنی محققی کا ڈنکا بجایا وہ کتنا بدل گیا تھا۔ ماشاء اللہ کیا قد نکالا تھا۔ جب میرٹھ میں دیکھا تھا تو نام خدا ابھی شاید مسیں بھی نہیں بھیگیں تھیں۔ چھریرا بدن' گوری رنگت' پتلے پتلے ہونٹ' ستواں ناک' جیسی اچھی صورت ویسا اجلا لباس' میرٹھ کالج کا نیا دانہ اور اب جو دیکھا تو نقشہ کچھ سے کچھ ہو چکا تھا' لمبا قد' چوڑا چکلا بدن' چہرہ سرخ و سفید' کلے میں گلوری' ہونٹوں پر پان کی لالی' جیب میں پانوں کی ڈبیا اور قوام کی ڈبچی۔ کتنی جلدی جلدی مگر کس شائستگی سے جیب سے یہ ڈبیاں نکلتی تھیں۔ ''ناصر صاحب' پان لیجئے۔ اور یہ قوام چکھئے۔'' ناصر کاظمی کو جمیل خاں کیا ملے' دونوں جہان کی نعمت مل گئی۔ فوراً ہی مجھے اپنی رائے سے آگاہ کر دیا۔ ''یہ تمہارے جمیل

صاحب آدمی شستہ ہیں۔"

پانوں کی اس ڈبیا اور قوام کی اس ڈبچی نے ہمارے بہنوئی شمشاد حسین کو بھی متاثر کیا۔ "ارے میاں تمہارے دوستوں میں بس یہی ایک جوان کام کا ہے۔ باقی تو سب مجھے یوں ہی سے لگتے ہیں۔"

جمیل جالبی اصل میں اپنے دادا میاں کے ایک خستہ و بوسیدہ مخطوطے سے برآمد ہوئے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ 1948ء میں نظام کے دفتر میں مجھے ایک مخطوطہ موصول ہوا۔ پہلے بوسیدہ ورقے شکستہ خط میں لکھے ہوئے۔ بھیجنے والے جمیل خاں۔ لکھا تھا کہ جالب دہلوی میرے دادا تھے۔ یہ ان کا مخطوطہ ہے۔ اسے نظام میں قسط وار شائع کیا جائے تو کیا خوب بات ہوگی۔ پتا نہیں کتنی قسطیں نظام میں چھپیں، مگر میرا پھوہڑ پن یا محققانہ روایت سے نا آشنائی کہ اس مخطوطہ کو سنبھال کر نہیں رکھا۔ ہاں اور ابھی اس مخطوطہ کی اشاعت کی ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہوا تھا کہ ایک اور مخطوطہ موصول ہوا۔ یہ خود جمیل خاں کا مخطوطہ تھا۔ سفید اجلے اوراق جمیل خاں کی خوش نما تحریر۔ موضوع پاکستانی کلچر۔ شاید اس کی بھی کچھ قسطیں نظام میں چھپی تھیں۔

زمانے بعد جمیل خاں نے مجھ سے ان دونوں مخطوطوں کا تقاضا کیا۔ مگر مجھ کم فہم سے ان مخطوطوں کی قدر و قیمت جاننے میں چوک ہوئی۔ اپنی لاپروائی سے انہیں گم کر دیا اور جمیل خاں پر اس کا ردعمل کیا ہوا۔ اپنے لکھے کو تو انہوں نے دوبارہ لکھ ڈالا اور شاید اب مطالعہ اور غور و فکر کے بعد زیادہ سمجھداری سے لکھا۔ یوں ان کی کتاب "پاکستانی کلچر" منصہ شہود پر آئی۔ باقی دادا کے مخطوطے کی گمشدگی کا جواب انہوں نے اس طرح دیا کہ اسی طرح کے خستہ و بوسیدہ کرم خوردہ مخطوطے تحقیق کر کر کے برآمد کرنے شروع کر دیئے اور جلد ہی نقاد سے محقق بن گئے۔ اسے دادا میاں کا فیضان کہنا چاہیے کہ ان کے ایک مخطوطے کی گمشدگی نے ان کے لیے تحقیق کا کام کیا۔ پھر ایسے مخطوطے دریافت کرنا ہی ان کا فن ٹھہرا۔ دادا کے احسان کا بدلہ انہوں نے اس طرح دیا کہ ان کے نام کو اپنے نام کے ساتھ چسپاں کر لیا اور جمیل خاں سے جمیل جالبی بن گئے۔

اب عسکری صاحب کی سنئے۔ اگر ادیبوں کا کنونشن ہوا تو اس میں بے چارے ادب کی کیا خطا ہے۔ عسکری صاحب کو دیکھو کہ وہ ادب ہی سے فرنٹ ہو گئے۔ میں نے حسب عادت ادب کا ذکر چھیڑا تو بولے "یار، میں تو تمہارا ادب وودب اب پڑھتا نہیں، قرآن کے جو اردو ترجمے ہوئے ہیں میں تو آج کل ان کا تقابلی مطالعہ کر رہا ہوں۔"

اور یہ تو حرف آغاز تھا۔ پر ہمیں پتا ہی ہے کہ عسکری صاحب پھر تصوف کے کوچے میں نکل گئے۔ سفر کرتے کرتے آخرش مولانا اشرف علی تھانوی پر جا کر دم لیا۔ پھر انہوں نے بقدر ضرورت ادبی تنقید کا بہشتی زیور بھی یہیں سے برآمد کر لیا، مگر وہ وقت ابھی دور تھا۔